نظر آتی۔ اور اُس لُطف میں لوگ اِس قدر محو اور مست و از خود رفتہ ہو رہے تھے کہ کسی کو انجام کی خبر ہی نہ تھی۔ عمارات شاہی اور رمنے وغیرہ کے اندر جانے کی اہلِ لکھنؤ جملہ ملازمین بلکہ ساکنینِ مٹیا بُرج کو عام آزادی حاصل تھی۔ باغوں میں پھریے تو اُس سے زیادہ پُر فضا مقام کہیں نصیب نہ ہو سکتا۔ دریا کے کنارے کھڑے ہو جائیے تو عجیب لطف نظر آتا۔ کلکتے کو آنے جانے والے جہاز سامنے سے ہو کے گزرتے، جو فورٹ ولیم کی سلامی کے لیے یہیں سے اپنی جھنڈیاں اُتارنا شروع کر دیتے اور لوگ سمجھتے کہ بادشاہ کی سلامی لے رہے ہیں۔ محلات کی ڈیوڑھیوں اور محل سراؤں کے دروازوں پر کھڑے ہو جائیے تو عجب لطف کی دھوم دھام میں کبھی کبھی ایسی صورتیں نظر آجاتیں اور ایسی فصیح و دل کش زبان اور ایسی مزے مزے کی پیاری باتیں سننے میں آجاتیں کہ انسان مدتوں بلکہ زندگی بھر مزہ لیا کرتا۔

آہ! یہ خوب صورت اور دل فریب نقش تو مٹنے کے قابل نہ تھا، مگر ہائے زمانے نے سٹا ہی دیا اور ایسا مٹایا کہ گویا تھا ہی نہیں۔ ۱۳۱۶ھ محمدی (۱۸۸۶ء) میں یکایک بادشاہ کی آنکھ بند ہوئی اور معلوم ہوا کہ خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا۔ سب باتیں خواب خیال تھیں۔ ایک طلسم تھا کہ یکایک ٹوٹ گیا اور وہ خوب صورت بقعہ جس کی زیارت کی تمنا یورپ کے سلاطین اور ہندوستان کے والیانِ ملک کو رہا کرتی تھی، آج ایک وحشتستانِ فنا اور عبرت کدہ ہے، جہاں کچھ بھی نہیں جس نے اُس اگلے رنگ کو کبھی دیکھا تھا، اب وہاں کے سناٹے کو دیکھ کے، سوا اِس کے کہ کمال حسرت و اندوہ کے ساتھ ایک ٹھنڈی سانس بھر کے کہے: رہے نام اللہ کا! اور کیا کر سکتا ہے۔

(۹)

اِس دربار کے فرماں رواؤں کی تاریخ میں سے اب صرف اِس قدر بتانا باقی ہے کہ مرزا برجیس قدر بہادر لکھنؤ سے بھاگے تو سرحدِ نیپال پر دم لیا۔ ہم راہ رکاب تقریباً ایک لاکھ آدمیوں کا مجمع تھا۔ اُن لوگوں نے ارادہ کیا کہ ہمالیہ کی گھاٹیوں میں پناہ گزین

ہو جائیں۔ اور جب موقع ملے، نکل کے انگریزوں پر حملہ کریں۔ فتح ہو تو اپنے وطن پہنچیں، شکست ہو تو پھر بھاگ کے پہاڑوں میں ہو رہیں۔ مگر یہ نبھنے والی صورت نہ تھی۔ ریاستِ نیپال نہ اتنے آدمیوں کو اپنے وہاں پناہ دے سکتی تھی اور نہ اُن کے لیے انگریزوں سے لڑ سکتی تھی۔ اُس میں اتنی قوت ہی نہ تھی کہ انگریزوں کا مقابلہ کرتی۔ لہٰذا حکومتِ نیپال نے صرف مرزا برجیس قدر اور اُن کی ماں کو تو پناہ دے دی، مگر اُن کے ہم راہی طوفانِ بے تمیزی کو قطعی حکم دے دیا کہ فوراً واپس جائیں اور نہ جائیں تو مار کے نکال دیے جائیں۔ نیپال کی قلمرو فوراً اُن سے خالی کرالی جائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سب کے سب وہاں سے نکل نکل کے بھاگے۔ بہت سے مارے گئے، بہت سے بھیس بدل بدل کے کسی طرف نکل گئے۔ اور مرزا برجیس قدر مع اپنی والدہ کے خاص نیپال میں جا کے سکونت پذیر ہو گئے۔ دربارِ نیپال سے اُن کے لیے کچھ معمولی وظیفہ مقرر ہو گیا۔ اور کہتے ہیں، اُن کے ساتھ جس قدر جواہرات تھا، سب دولتِ نیپال کی نذر ہوا۔ آخر حضرت محل وہیں پیوندِ زمیں ہوئیں اور اُن کے بعد ملکۂ وکٹوریا کی جُبلی کے موقع پر دولتِ برطانیہ نے مرزا برجیس قدر کا قصور معاف کر دیا۔ اُنھیں واپس آنے کی اجازت ملی تو بغیر کسی کو اطلاع دیے نیپال سے بھاگ کے کلکتے پہنچے۔ یہاں واجد علی شاہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ اور حیثیتِ اولادِ اکبر مرزا قسمت قدر سب سے زیادہ تنخواہ پا رہے تھے۔ برجیس قدر نے دعوا کیا کہ بادشاہ کے تمام بیٹوں سے زیادہ معزز و مستحق میں ہوں، از روے قانونِ پنشن، بادشاہ کی پنشن میں سے ایک ثلث گھٹا کے، باقی تنخواہ مجھ پر جاری کی جائے اور اُن کے تمام ورثا اور وابستگانِ دامن کی خبر گیری میرے ذمے کی جائے۔ اس کی پیروی میں وہ انگلستان میں جانے کی تیاریاں کر ہی رہے تھے کہ اُن کے خاندان والوں ہی میں سے کسی نے دعوت کی۔ دعوت سے واپس آئے تو قے اور دست جاری ہو گئے۔ آناً فاناً حالت خراب ہو گئی اور ایک ہی دن میں وہ، اُن کی بی بی، اور ان کے کئی فرزند، سب کی زندگی کا خاتمہ ہو گیا۔ اور دنیا اِس خاندان کی اُن تمام

ماد گاروں سے خالی ہو گئی جنھوں نے کبھی تخت و تاج کی صورت دیکھی تھی۔

تاہم مٹیا برج کی چہل پہل اور اِس نئی بستی کی رونق و آبادی نے ایسی صورت پیدا کر لی تھی کہ اگر چشمِ زخمِ حوادث سے بچ جاتا تو مدّتوں تک یاد دلاتا رہتا کہ اُس بخت برگشتہ بادشاہ کے دربار اور اس کے وابستگانِ دامن کی کیا وضع قطع تھی اور اُن کا کیا مذاق تھا۔ مگر برٹش گورنمنٹ کی عدالت گستری نے واجد علی شاہ کا ترکہ تقسیم کرنے اور اُن کے وُرثا کی دادرسی میں یہ شانِ عدالت دکھائی کہ ساری جایداد اور سارا گھر بار بیچ کے حصہ رسدی سب میں تقسیم کر دیا جائے۔ اور جو کچھ ہے، نقد روپے کی صورت میں کر لیا جائے۔ اِس کا لازمی نتیجہ تھا کہ مٹیا برج کی اینٹ سے اینٹ بج گئی۔ لاکھوں کا سامان کوڑیوں کو بک گیا۔ اور وہی بقعہ جو چند روز میں باغِ اِرم بن گیا تھا حضیضِ ادبار کا جہنم ہو کے رہ گیا۔ اب تم وہاں جا کے خاک اُڑاؤ، کچھ نہ نظر آئے گا۔ اگر آنکھیں اگلی رونق اور چہل پہل کو ڈھونڈتی ہوں تو کسی امرؤ القیس[عہ] کو بلاؤ جو آنسو بہاتا جائے اور تمھیں بتاتا جائے کہ یہاں مرصّع منزل تھی، یہاں نور منزل تھی، یہاں سلطان خانہ تھا اور یہاں اسد منزل تھی۔ وہاں مشاعرے ہوتے تھے، وہاں علمائے باکمال کی مجلس تھی، وہاں یارانِ باصفا کی بذلہ سنجیاں تھیں، اور وہاں فصحائے جادو بیان کی سحر طرازیاں تھیں۔ اِس مقام پر منتخب حسینانِ جہان کا جھرمٹ تھا، اس مقام پر رقص و سرود کی محفل گرم تھی، اس مقام پر حور وش مہ جبینوں کو گانے ناچنے کی تعلیم ہوتی تھی، اور اس مقام پر جہاں پناہ ناز آفریں ممنوعات کے بیچ میں بیٹھ کے جشن منایا کرتے تھے۔ اس جگہ افیونیوں کے مجمع میں داستان ہوتی تھی۔ اُس جگہ بٹیروں کی پالیاں ہوتی تھیں، اس جگہ کبوتر اُڑتے تھے، اور اس جگہ کنکوّے کے میدان بدے جاتے تھے۔ اِس ڈیوڑھی پر ماہ وش جادو نگاہیں پردے سے سر نکالے

عہ جاہلیتِ عرب کا ایک نہایت مشہور شاعر جس نے اپنے قدیم عشرت کدے کی ویرانی اور تباہی کی تصویر نہایت ہی سوز و گداز کے الفاظ میں دکھائی ہے۔ ۱۲

جھانکتی نظر آتی تھیں۔ اس ڈیوڑھی پر ماما، اصیلوں کی آمد و رفت سے ہر وقت ایک عجیب جوش و خروش نمایاں رہتا تھا، اِس ڈیوڑھی پر خاص شعرا حاضر رہتے، اس لیے کہ محل سرا والی کو فنِ شعر سے دلچسپی تھی، اور اِس ڈیوڑھی پر روز رنگین عبارت لکھنے والے جوان مزاج ادیبوں کی تلاش رہتی تھی، اِس لیے کہ دوسرے تیسرے یہاں سے ایک نئے رنگ کا توڑ دونامہ[عہ] جا کے بادشاہ کے ملاحظے میں پیش ہوتا۔

لیکن مٹیا برج کے مٹ جانے پر بھی اُس مرحوم دربار کی ہزاروں یادگاریں باقی ہیں۔ خود شہرِ لکھنؤ اور اُس کی سوسائٹی اُس دربارِ دُربار کو یاد دلا رہی ہے۔ اور اودھ کی سرزمین کا چپّہ چپّہ اُس کی عظمت کی یادگار ہے۔ اس لیے کہ اُس پر جا بجا سلطنتِ ماضیہ کے مار کے بنے ہوئے ہیں۔ اہلِ لکھنؤ کی ہر حرکت اور ادا اگلے ارکانِ دربار کی زندہ تاریخ ہے اور اُن کی چال دیکھ کے بے اختیار زبان سے نکل جاتا ہے:

ای گل بتو خرسندم تو بوی کسی داری

لہٰذا ان دیرپا آثارِ سلف کی یاد تازہ کرنے کی غرض سے اب ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اُس دربار کے قائم ہونے سے لکھنؤ میں جو سوسائٹی پیدا ہو گئی تھی، وہ کیا تھی؟ کیسی تھی؟ اور اُس نے کس عنوان سے ہندوستان کی معاشرت پر اثر ڈال رکھا تھا۔

ہندوستان میں اُن دنوں فارسی زبان کورٹ لینگوج (درباری زبان) تھی اور اہلِ ہندوستان کی بہترین معاشرت، ایرانی تہذیب سے ماخوذ تھی۔ دولتِ صفویہ کے عہد میں ایرانیوں کا عام مذہب شیعۂ اثنا عشری ہو گیا تھا اور ہندوستان کا حکمراں خاندانِ مغلیہ چغتائیہ، مذہب اہلِ سنّت کا پیرو تھا۔ مگر معاشرت پر فارسیت کا سکہ جاری ہونے کا یہ اثر تھا کہ باوجود اختلافِ مذہب کے، جو بھی یہاں آتے، ادب کے ہاتھوں سے لیے جاتے تھے۔

عہ توڑ دونامہ اُن خطوط کو کہتے تھے جو بیگمات و محلاتِ عالیات، جہاں پناہ کی خدمت میں بھیجتیں جو عموماً عاشقانہ رنگ میں ہوتے۔

اِسی اخلاقی رجحان نے نورجہاں بیگم کو جہاں گیر کے تاج و تخت کا مالک بنا دیا۔ اُسی کی بدولت دہلی کے اکثر معزز عہدے دار آخر عہد میں شیعہ تھے۔ اور اِسی کی وجہ سے امین الدین خاں نیشاپوری یہاں پہنچتے ہی، نواب بُرہان الملک بن کے، وادیِ گنگا کے سارے وسیع علاقے کے مالک ہو گئے۔ بُرہانُ الملک کا اثر اور اقتدار جس قدر بڑھتا اور ترقی کرتا گیا۔ اُسی قدر زیادہ وہ باکمالانِ دہلی کے مرجع و ماوا بنتے گئے۔ باوجود اس کے اُن کی اور نواب صفدر جنگ کی زندگی چوں کہ ایک نئی سلطنت کی داغ بیل ڈالنے میں صرف ہوئی، اس وجہ سے سولے بہادر سپہ گروں کی قدردانی کے، اُنھیں قومی تمدّن اور معاشرتی اُمور کی طرف متوجہ ہونے کی، بہت ہی کم مہلت ملی۔ کیوں کہ ان باتوں کو بہ مقابل فوج کشی و فتح مندی کے، امن و امان کے پُرعیش زمانے سے زیادہ تعلق ہوا کرتا ہے۔

لیکن جب شجاع الدّولہ نے بکسر کی لڑائی میں ہمت ہارنے کے بعد انگریزوں سے نیا معاہدہ کیا اور مجبور ہو کے فیض آباد میں خاموش بیٹھے تو سرزمینِ اودھ میں ایک نئے تمدّن کی بنیاد پڑ گئی۔ اس مضمون کے آغاز میں ہم بتا چکے ہیں کہ شجاع الدّولہ کے زمانے میں کس کثرت سے باکمالانِ دہلی وطن چھوڑ چھوڑ کے یہاں آنے لگے تھے۔ دہلی سے فیض آباد تک ہر پیشے اور ہر طبقے کے لوگوں کے آنے کا کیسا تانتا بندھ گیا تھا اور صرف نو سال کی مدت میں فیض آباد کیا سے کیا ہو گیا تھا؛ شجاعُ الدّولہ کے بعد نواب آصف الدّولہ نے جب لکھنؤ میں قیام کیا تو فیض آباد کا جما جمایا اکھاڑا ایک بارگی فیض آباد سے اُکھڑ کے لکھنؤ میں آ گیا اور دہلی کے اعلا خاندانوں اور باکمالوں کا جو سیلاب فیض آباد کو جا رہا تھا لکھنؤ ہی میں روک لیا گیا جو کہ عین سرِ راہ واقع ہوا تھا۔ اور آخر میں چند شُرفا و صاحبِ ہُنر جو فیض آباد میں بیگموں کی سرکاروں میں اُلجھے رہ گئے تھے، رفتہ رفتہ وہ بھی لکھنؤ میں آ گئے۔ اس لیے کہ آصف الدولہ نے یہاں دولت کی ایسی گنگا نہیں بہا رکھی تھی کہ کوئی سنتا اور سیراب ہونے کے شوق میں بے اختیار نہ دوڑ پڑتا

اُن دِنوں یوں تو بہت سی ہندو ریاستیں موجود تھیں مگر مہذّب اور شائستہ دربار مسلمان حکم رانوں ہی کے سمجھے جاتے تھے۔ اور ہندو راجا خود مُعترف تھے کہ تمدّن اور معاشرت میں ہم مسلمان درباروں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ کیوں کہ اپنی قدیم تہذیب کو زندہ کر کے اپنے لیے نیا تمدّن اور نیا لٹریچر پیدا کرنے کا خیال ابھی اُن میں انگریزی تعلیم نے نہیں پیدا کیا تھا۔ اِس کا نتیجہ یہ تھا کہ اگر کوئی باکمال عالِم، شاعر، یا سپاہی، مسلمان اُمرا سے برخاستہ خاطر ہو کے ہندو اُمرا کے علاقے میں پہنچ جاتا تو ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا اور دیوتاؤں کی طرح اُس کی قدر و منزلت کی جاتی۔

مسلمان دربار اُن دنوں چند گنتی کے تھے۔ سب سے پہلے تو دہلی کا دربارِ معلیہ تھا اور اُس کی قدامت اور گذشتہ شوکت کی وجہ سے ہر قسم کے باکمالوں اور مستند خاندانی شرفا کی کان دہلی بنی ہوئی تھی۔ اور اُسی سرزمین کے منتشر روڑے تھے جنھوں نے دُور دراز صوبوں میں جا کے نئے نئے دربار قائم کیے تھے جن میں سے دکن میں آصف جاہ کا دربار تھا۔ وہاں سے آگے بڑھ کے ٹیپو سلطان اور نواب ارکاٹ کے دربار تھے شمال میں دہلی سے چلیے تو پہلے روہیل کھنڈ کے بہادر خوانین کی قلمرو ملتی۔ اس کے بعد یہ اودھ کا دربار تھا۔ پھر اس سے آگے مرشد آباد میں نواب ناظمِ بنگالہ کا دربار تھا۔ مذکورہ اسلامی درباروں سے دکن کے دربار نہایت ہی دور تھے۔ اُن کا راستہ اوّل تو جنگلوں اور پہاڑوں کی وجہ سے نہایت ہی دُشوار گذار تھا۔ اور اُس پر بھی جرأت کر کے کوئی چل کھڑا ہوتا تو ٹھگ اور ڈاکو جو سارے ملک میں پھیلے ہوئے تھے، راستے ہی میں اُس کی زندگی کا خاتمہ کر دیتے۔ ٹیپو سلطان اور نواب کرناٹک کی قلمرو تک جانا درکنار کسی کو نظام حیدرآباد کی مملکت تک پہنچنا بھی مشکل سے نصیب ہوتا۔ اس لیے جب دہلی بگڑنا شروع ہوئی اور تاجدارانِ معلیہ کی حالت خراب ہونے سے قدردانی کا بازار وہاں سرد پڑا، تو لوگوں نے عموماً شمالی ہندوستان کا رخ کیا۔ اس میں شک نہیں کہ روہیل کھنڈ بہت قریب تھا۔ یہاں کے

خوانین اگر قدردانی کرتے تو اُن سے زیادہ موقع کسی کو نہیں حاصل تھا۔ مگر اُن میں دین داری تھی، شجاعت تھی اور بہت سی خوبیاں تھیں، مگر علمی مذاق اور معاشرتی رنگینوں سے وہ لوگ بالکل مُعرّا تھے۔ اُن کی حالت کا صحیح اندازہ کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ خالص فوجی مذاق کے لوگ تھے جنھیں اپنے ہم وطنوں کے جمع کرنے اور اپنے جرگوں کی تعداد بڑھا کے اپنی جنگی قوت کو ترقی دینے کے سوا اور کسی بات کا شوق نہ تھا۔ معاشرت کے رسیلے پن اور تمدّنی زندگی کے آداب و اخلاق کے لحاظ سے دیکھیے تو اُن کی حالت بالکل وحشی گنواروں کی سی تھی۔ ایسے لوگ بھلا شاعروں، ادیبوں اور دیگر قسم کے باکمالوں کی کیا قدر کر سکتے تھے؟ لہٰذا اُن کی سرزمین میں جو داخل ہوا، قدم بڑھاتا ہوا آگے نکل گیا۔ چار پانچ منزلیں طے کر کے لکھنؤ میں پہنچا تو دیکھا کہ رئیس سے لے کے ادنا طبقے والے تک استقبال میں آنکھیں بچھا رہے ہیں اور ہر طرح خدمت گزاری کو تیار ہیں۔ ایسی جگہ پہنچ کے پھر بھلا کون واپس آسکتا ہے؟ جو گیا وہیں کا ہو گیا۔ اور دہلی کا ہر خانماں برباد یہاں آتے ہی پاتو توڑ کے بیٹھ گیا۔ نہ وطن ہی یاد رہا اور نہ کسی اور دربار کے دیکھنے کی ہوس ہی دل میں باقی رہی۔ چند لوگ یہاں سے آگے بڑھ کے نواب ناظم بنگالہ تک بھی پہنچ گئے، مگر وہ وہی تھے جن کی لکھنؤ قدر نہ کر سکا۔ مگر ایسے چند گنتی ہی کے لوگ تھے۔ ورنہ دہلی سے جتنے باکمال آئے، سب لکھنؤ ہی میں کھپتے چلے گئے، تھوڑے ہی زمانے کے اندر یہ حالت ہو گئی کہ اُس دَور کی مہذّب ترین سوسائٹی کے جتنے مشہور اور نام ور بزرگ تھے، سب لکھنؤ کے اندر جمع تھے۔

فقط ایک چیز لکھنؤ میں اس دربار کے قائم ہونے سے پہلے موجود تھی اور وہ عربی کا علم و فضل تھا جس کی بنیاد اُس وقت پڑ گئی تھی جب شہنشاہ اورنگ زیب نے فرنگی محل کے مکانات مُلّا نظام الدّین سہالوی کو عطا کیے تھے۔ مُلّا صاحب ممدوح اور ان کے خاندان کے قیام نے چند ہی روز میں فرنگی محل کو ہندوستان کی ایک ایسی اعلا ترین

یونی ورسٹی بنا دیا کہ سارے ہندوستان کے علما و فضلا کا مرکز لکھنؤ کا یہی چھوٹا سا محلّہ قرار پایا۔ شیخ عبدالحق دہلوی کے بعد دہلی میں بھی کوئی نمود کا عالم نہیں پیدا ہو سکا تھا۔ آخر میں شاہ ولی اللہ صاحب کے خاندان نے البتّہ بہت بڑا عروج حاصل کیا، مگر اُن کی شہرت علم حدیث تک محدود تھی۔ مگر حدیث کے علاوہ اور جتنے علوم ہیں، اُن سب کی یونی ورسٹی لکھنؤ ہی تھا۔ اُن دنوں لکھنؤ ایک گم نام شہر تھا۔ مگر ایسے ایک گم نام مقام کا اتنی بڑی یونی ورسٹی بن جانا کہ ہندوستان در کنار، بخارا، خوارزم، اور ہرات و کابل، اُس کے آگے سر جھکا دیں، بہت ہی حیرت کے قابل ہے۔ ساری اسلامی دنیا یہیں کی شاگردی پر فخر کر رہی تھی اور یہیں کے منتخب کیے ہوئے نصابِ تعلیم یعنی سلسلۂ نظامیہ کی پیرو تھی۔ غرض علمائے فرنگی محل کی بدولت اِس نئے دربار کے قائم ہونے سے پہلے ہی لکھنؤ حکمت و فلسفہ، منطق و کلام، فقہ و اُصولِ فقہ اور دیگر مختلف عُلوم کا معدن و مرجع بن چکا تھا۔ لہٰذا ایک اِس چیز میں تو لکھنؤ اس نئے دربار کا زیرِ بارِ احسان نہیں ہے، باقی اور تمام ترقیاں اِس سلطنت کے قائم ہونے ہی سے پیدا ہوئیں۔

اب ہم جدا جدا بیان کرنا چاہتے ہیں کہ دہلی سے لکھنؤ میں کون کون سی چیزیں آئیں اور یہاں آ کے انھوں نے کیا رنگ پکڑا۔ سب سے مقدّم اُردو زبان ہے جو دہلی کے اُن شرفا اور سردارانِ فوج کی زبان تھی جو اب برہان الملک بہادر کے ساتھ لکھنؤ میں آئے تھے۔ یہ زبان دہلی میں پیدا ہوئی۔ اور اُس کی شاعری کا آغاز دکن سے ہوا۔ ولی گجراتی نے دہلی میں آ کے اپنا دیوان پیش کیا۔ اور اپنے نغمۂ دل کش سے اہلِ زبان کو خوابِ غفلت سے جگایا۔ اِس نغمے میں کچھ ایسا جادو تھا کہ سنتے ہی سب کی زبان پر یہی نغمہ جاری ہو گیا اور دہلی میں اُردو شاعری شروع ہو گئی۔

ابتدا چند ہی بزرگ تھے جنھوں نے استادی کی شان سے دہلی میں دادِ سخن دینا شروع کی۔ مگر اُس زمانے کو اگر اُردو زبان کی طفلی نہیں تو اُردو شاعری کا بچپن کہنا چاہیے۔

دنیائے اُردو کے اُن سابقینُ الاوّلین میں سب سے زیادہ صاحبِ علم و فضل اور سب سے بڑے باکمال خانِ آرزو تھے، جنھیں مولانا آزاد مرحوم نے دوسرے دورِ شاعری میں رکھا ہے۔ زمانۂ مابعد کے بڑے بڑے باکمال جن میں سودا، میر، میرزا مظہرِ جانِ جاناں اور خواجہ میر درد شامل ہیں، سب اِن کے شاگرد تھے۔ شاعری اور کمالِ زباں دانی کے لکھنؤ میں آنے کی بنیاد انھی استادِ اوّل خانِ آرزو سے پڑی۔ نواب شجاع الدّولہ کے ماموں سالار جنگ نے کمال قدردانی سے انھیں لکھنؤ بلوایا، اور ایک زمانے تک اودھ میں اقامت گزیں رہ کے وہ شجاع الدّولہ کی مسند نشینی کے دو برس بعد سنہ ۱۱۶۹ھ (سنہ ۱۱۸۴ محمدی مطابق سنہ ۱۷۵۲ع) میں خاص لکھنؤ کے اندر رہ گرائے آخرت ہوئے۔ وہی پہلے استاد اردو شاعری کے تھے اور انھی سے اردو شعر و سخن کے لکھنؤ میں آنے کی بنیاد پڑی۔ مگر افسوس کہ اُن کی ہڈیاں، سرزمینِ لکھنؤ کے دامنِ شوق سے چھین کے، خاکِ دہلی کو سونپی گئیں۔

اِس کے بعد اُسی دور کے دوسرے نامی استادِ سخن اشرف علی خاں فغاں نے جو احمد شاہ بادشاہ کے کوکا تھے، قدردانی کی تلاش میں لکھنؤ کی راہ لی۔ شجاع الدّولہ نے نہایت ہی تعظیم و تکریم کی۔ ہاتھوں ہاتھ لیا اور ایک زمانے تک اپنے دربار میں رکھا مگر شعرا نازک خیال سے زیادہ نازک دماغ ہوا کرتے ہیں، کسی خفیف سی بات پر روٹھ کے عظیم آباد چلے گئے اور شجاع الدّولہ کی وفات سے دو برس پہلے وہیں پیوندِ زمیں ہو گئے۔

اب مولانا آزاد کا مقرر کیا ہوا تیسرا دورِ شاعری شروع ہوا، جب کہ خانِ آرزو کے شاگرد نظمِ اردو پر حکومت کر رہے تھے۔ اُس زمانے کی حالت دیکھنے سے نظر آتا ہے کہ دہلی اپنے باکمالوں کو اپنے آغوش میں سنبھال نہیں سکتی۔ ہر طرح کے صاحبانِ کمال اُس کے سواد سے نکلتے چلے جاتے ہیں، اور رہ جاتا ہے پھر نہیں آتا۔ اس کے مقابل لکھنؤ کی یہ حالت ہے کہ جو صاحبِ فن آتا ہے، چاہے کہیں کا ہو، یہیں کا ہو جاتا ہے۔ مرزا رفیع سودا، میر تقی میر،

سیّد محمد میر سوز جو اس تیسرے دور کے پیمبرانِ سخن ہیں، سب دہلی چھوڑ چھوڑ کے لکھنؤ میں آئے اور یہیں پیوندِ زمیں ہو گئے۔

اِن کے علاوہ جو باکمالانِ سخن اُس زمانے میں واردِ لکھنؤ ہوئے اور یہیں کے ہو گئے، میرزا جعفر علی حسرت، میر حیدر علی حیراں، خواجہ حسن حسن، میرزا فاخر مکین، میر ضاحک، بقاء اللہ خاں بقا، میر حسن دہلوی، میر ضاحک کے فرزند (صاحب مثنوی) اور انھی کے ایسے بیسیوں شعرا ہیں۔ میر قمر الدّین منت۔ میر ضیاء الدّین ضیا۔ اشرف علی خاں فغاں دہلی سے لکھنؤ میں آ کے ایک مدت تک رہے اور یہیں چمکے۔ مگر آخر میں بیرونی قدر دانوں کی کشش سے کلکتے اور عظیم آباد میں جا کے نذرِ اجل ہوئے۔ شیخ محمد قائم قائم کا انتقال اگرچہ اُن کے وطن نگینے میں ہوا، مگر وہ بھی ایک مدت تک اِسی لکھنؤ کی سبھا کے ایک ایکٹر تھے۔

صرف میرزا مظہرِ جانِ جاناں اور خواجہ میر درد کے ایسے چند بزرگ دہلی میں پڑے رہ گئے، جن کو فقیرانہ قناعت اور مرجعیّت کی وجہ سے دہلی میں قدم جمانے کا موقع مل گیا تھا اور سجادہ نشینی کی وجہ سے اپنی مسندِ درویشی کو نہ چھوڑ سکتے تھے۔ بغرض شاعری کا یہ تیسرا دور وہ زمانہ ہے جب کہ دہلی کی سبھا وہاں سے اُکھڑ کے لکھنؤ میں جم رہی تھی اور لکھنؤ میں ایک جوشِ قدردانی تھا جس سے ہندوستان کی تاریخ خالی ہے۔

اب چوتھا دور شروع ہوا۔ اس کے ارکان بھی اگرچہ دہلی و اکبر آباد وغیرہ کی خاک سے پیدا ہوئے تھے مگر سب کی شاعری لکھنؤ ہی میں چمکی۔ یہیں سے ان کا نام مشہور ہوا۔ یہیں کے مشاعروں کے میرِ مجلس تھے۔ یہ لوگ علی العموم یہیں سے نکلے، یہیں رہے، یہیں عروج پایا اور یہیں مرکھپ گئے۔ اُس دور کے رکنِ رکین، جرأت، سیّد انشا، مصحفی، قتیل اور رنگین وغیرہ تھے۔ یہ لوگ اپنے عہد میں زبان پر حکومت کر رہے تھے اور ان کی شاعری کا غلغلہ اس قدر بلند تھا کہ ان کے سامنے کسی اردو شاعر کا نام چمک

ہی نہ سکا۔ ان سب کی ہڈیاں کہاں ہیں، لکھنؤ کی خاک میں۔

اُس زمانے میں دہلی کے صاحبانِ مذاق جس کثرت سے لکھنؤ آرہے تھے، اس کا اندازہ سید انشا کی ایک روایت سے ہوسکتا ہے جس میں انھوں نے اُس عہد کے ایک شریف وضع دار بُڈھے اور نوراً نام ایک کسبی کی گفتگو نقل کی ہے۔ وہ بزرگ اور کسبی دونوں دہلی کے ہیں مگر دونوں لکھنؤ میں باتیں کر رہے ہیں۔ بی نوراً کہتی ہیں:

"اجی آؤ میر صاحب! تم تو عید کا چاند ہوگئے، دلّی میں آتے تھے، دو دو پہر رات تک بیٹھتے تھے۔ لکھنؤ میں تمھیں کیا ہوگیا کہ کبھی صورت بھی نہیں دکھاتے۔ اب کی کربلا میں کتنا میں نے ڈھونڈھا، کہیں تمھارا اثر آثار معلوم نہ ہوا۔ ایسا نہ کیجیو کہ آٹھوں میں بھی نہ چلو۔ تمھیں علیؑ کی قسم، آٹھوں میں مقرر چلیو۔"

اس کا جواب جو میر صاحب نے دیا ہے، وہ اگرچہ نہایت ہی دل چسپ ہے مگر ہم تطویل سے بچنے کے خیال سے اُسے چھوڑے دیتے ہیں۔ انھوں نے دہلی و لکھنؤ کے موجودہ رنگ پر اعتراضات کیے ہیں اور معاصر شعرا پر نکتہ چینیاں کی ہیں، جس سے ہمیں بحث نہیں۔ ہمیں صرف یہ بتانا ہے کہ اُس زمانے میں شرفا و کملا در کنار، رنڈیاں تک آ آ کے لکھنؤ میں بستی جاتی تھیں۔ اور جو لوگ دہلی میں پھول والوں کی سیر کے رسیا تھے، اب کربلا اور آٹھوں کے میلے میں اپنا دل بہلاتے تھے۔

شمس العلما مولانا آزاد مرحوم نے بعد کے تمام شعرائے دہلی و لکھنؤ کو بلا لحاظ امتیاز وعہد، ایک جگہ جمع کرکے اور زمانے کی طنابیں کھینچ کے، پانچواں دور بنا دیا ہے۔ لیکن یہ ناانصافی ہے۔ اصلی پانچواں دَور صرف ناسخ و آتش کا تھا، جس میں زبان نے نئی وضع اختیار کی، بہت سے پُرانے محاورات ترک ہوگئے، نئی بندشیں پیدا ہوئیں، اور اُس زبان کی بنیاد پڑی جو بعد کے شعرائے دہلی و لکھنؤ میں یکساں طور پر مقبول ہوئی۔ اور قریب قریب وہ زبان بن گئی جو اب ہندوستان میں مستند ہے۔ اور یہی وہ زمانہ تھا جب شاعری

کی قلمرو میں پہلے پہل لکھنؤ کا سکّہ جاری ہوا۔

اِس کے بعد چھٹا دَور وہ تھا جب لکھنؤ میں وزیر، صبا، رند، گویا، رشک، نسیم دہلوی، اسیر، نواب مرزا شوق، اور پنڈت دیا شنکر نسیم صاحبانِ مثنوی کی شاعری کا غلغلہ بلند تھا۔ اور دہلی میں مومن، ذوق، غالب نغمۂ شاعرانہ سنا رہے تھے۔ اِس دَور نے سچ یہ ہے کہ زبان کو بہ لحاظِ خیالات سب سے زیادہ ترقی کے درجے پر پہنچا دیا۔

اِس کے بعد ساتواں دَور امیر، داغ، منیر، تسلیم، مجروح، جلال، لطافت افضل، اور حکیم وغیرہ کا تھا۔

اِن آخری دَوروں پر غائر نظر ڈالنے سے صاف نظر آجاتا ہے کہ فصاحتِ زبان اور شاعری نے لکھنؤ میں کیسی مضبوط جگہ پکڑلی تھی چند ہی روز میں شعر کہنا، لکھنؤ میں ایک وضع داری بن گیا اور شعرا کی یہاں اس قدر کثرت ہوگئی کہ شاید کہیں کسی زبان میں نہ ہوئی ہوگی۔ عورتوں تک میں شعر و سخن کا چرچا ہوا۔ اور جہلا کے کلام میں بھی شاعرانہ خیال آفرینیوں، تشبیہوں اور استعاروں کی جھلک نظر آنے لگی۔

(۱۰)

فارسی شاعری کا اصلی اُٹھان مثنوی سے ہوا ہے۔ اور یہ صنفِ شاعری ہمیشہ سب سے زیادہ اہم اور باوقعت سمجھی گئی۔ ابتدا فردوسی کی رزمیہ مثنوی شاہنامے سے پڑی۔ پھر نظامی، سعدی، مولانائے روم، خسرو، جامی اور ہاتفی وغیرہ نے اس میں اعلا ترین شہرت و نام وری حاصل کی۔ اُردو میں میر تقی میر نے چھوٹی چھوٹی بہت سی مثنویاں دہلی و لکھنؤ کے قیام کے زمانے میں لکھی تھیں مگر وہ اِس قدر مختصر اور معمولی ہیں کہ مثنویوں کے تذکرے میں اُن کا ذکر بھی بے محل سا معلوم ہوتا ہے۔ مثنوی لکھنے کا آغاز اردو میں میر ضاحک کے بیٹے میر غلام حسن حسن سے ہوا جو